

JadoJhad Ki Adhuri Kahani

[اچا فیروز ہمارے پڑوس میں رہتے تھے۔ پڑوسی ہونے کے ناتے والد صاحب ان کا خیال رکھتے، وہ بہت غریب آدمی تھے اور محنت مزدوری کر کے اپنے کنبے کی کفالت کر رہے تھے۔ ان کی چار بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا، جس کا نام راشد تھا۔ ان دنوں ہم خانیوال میں رہتے تھے۔ یہاں والد صاحب کی کچھ زرعی اراضی تھی، جس کی دیکھ بھال اور پیداوار سے ہمارا خاندان خوش حال تھا۔ چچا فیروز ہمارے رشتہ دار نہیں تھے تاہم والد صاحب ان سے بھائیوں جیسا تعلق رکھتے تھے، کیونکہ برسوں پرانی ہمسائیگی چلی آ رہی تھی اور راشد میرے بھائی افتخار کے ساتھ کھیل کر بڑا ہوا تھا۔ دونوں کی بچپن سے دوستی تھی۔ راشد جب بھی ہمارے گھر آتا تو والدہ دیسی گھی، شکر اور پراٹھے سے اس کی تواضع کرتیں وہ اچھی عادات کا مالک بے حد ذہین اور حساس دل رکھنے والا لڑکا تھا۔ اپنے باپ کی طرح تند مزاج نہیں تھا۔ بھائی افتخار جب اسکول جاتے راشد کا جی کرتا کہ وہ بھی اسکول جائے لیکن چچا فیروز اسے پڑھانے کے حق میں نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ پڑھ لکھ گیا تو مزدوری نہیں کر پائے گا اور توکری فی زمانہ غریب کی اولاد کو ملتی نہیں، پھر کیا فائدہ اسکول بھیجنے کا؟ وہ خود بھی پڑھے لکھے نہ تھے لیکن راشد کی ماں کو بڑا شوق تھا کہ اس کا بیٹا پڑھ جائے، جیسے ہر ماں کا ارمان ہوتا ہے۔ دراصل راشد کا ماموں تعلیم یافتہ اور اچھے عہدے پر فائز تھا۔ سو راشد کی ماں کا انٹیڈیل اس کا بھائی تھا، جس نے تعلیم کے بل بوتے پر معاشرے میں باعزت مقام حاصل کیا تھا تبھی وہ یہ چاہتی تھی کہ اس کا لخت جگر اپنے ماموں کے نقش قدم پر اپنی منزل پالے اور سارے کنبے کو غربت کے جان لیوا اندھیرے سے باہر کھینچ لے جائے۔ رضیہ سلانی کڑھائی کر کے شوہر کا معاشی سہارا بنی ہوئی تھی تاکہ وہ لڑکے کو اسکول بھیجنے پر راضی ہو جائے۔ بالآخر میرے والدین کے سمجھانے پر چچا فیروز بیٹے کو اسکول بھیجنے پر راضی ہو گئے۔ راشد نے پانچویں کا امتحان پاس کر لیا تو اس کے باپ نے اسے پڑھائی سے ہٹالیا اور بیوی سے کہنے لگے۔ اب تو تیرے بیٹے کو لکھنا پڑھنا آگیا ہے۔ اتنی تعلیم کافی ہے۔ یہ تیرہ برس کا ہو گیا ہے، ابھی سے کام پر لے جانوں گا تو آگے کچھ کر پائے گا، ورنہ کام ہڈیوں میں اترے گا نہیں، مشقت سے جی چرائے لگے گا۔ شوہر کے اس فیصلے پر بیوی کا دل کٹ کر رہ گیا۔ رضیہ چاچی کسی صورت بیٹے کا مستقبل تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ ایک دیہاتی عورت کے لئے شوہر کے سامنے زبان کھولنا بھی کٹھن بات تھی۔ تب وہ میرے والد کے پاس آئی۔ کہا کہ بھائی صاحب، میرے بھائی کو میری طرف سے خط لکھ دو۔ اس نے خط میں بڑی منت سماجت کی تھی کہ وہی بھانجے کو اپنے پاس بلا کر اسکول میں داخل کروا دے تاکہ وہ سنہری خواب جو اس کی آنکھیں بیٹے کے لئے دیکھنا چاہتی تھیں، ان کا اس طرح غربت کی چھری سے قتل نہ ہو۔ خط کی عبارت میں انسونوں کی نمی بھی گھلی ہوئی تھی۔ xax0\ ابا نے رضیہ چاچی کے بھائی کو خط لکھ دیا۔ جو عبارت اس خاتون نے لکھوائی سب تحریر کر کے خط پوسٹ کر دیا۔ بھائی کے دل پر بہن کی التجا کا گہرا اثر ہوا وہ شخص خط ملتے ہی حیدر آباد سے خانیوال اپنے بھانجے کو لینے آگیا۔ اپنی خوشیوں میں مگن رہنے والے بھائی نے جب دکھبازی بہن کے گھر غربت کا دردناک منظر دیکھا تو لرز کر رہ گیا۔ اسے خیال آیا کہ ایک مدت بہن کی طرف سے غافل رہ کر اس کی کتنی حق تلفی کی ہے۔ یہاں تو فاقوں کا راج تھا، پھر بہنوئی بیٹے کو کیونکر پڑھاتا؟ گھر کیا تھا، جس کی چھت گرمیوں میں ڈھوپ کو نہ روک سکتی تھی اور سردیوں میں بارش کی بوجھاڑیں اپنی من مانی کرتی تھیں۔ چاروں بھانجیاں خاصی سیانی ہو چکی تھیں۔ ان کا بوجھ بھی دھرتی کا سینہ شق کرنے کو کافی تھا۔ اسے اپنی صابر اور مظلوم بہن پر بڑا ترس آیا اور بہنوئی کو قائل کرنے کی ٹھان لی۔ اول تو فیروز چچا پہلے تو اپنے بیٹے کو ماموں کے ساتھ بھیجنے پر تیار نہ تھے لیکن سب گھر والوں اور کچھ رشتہ داروں کے اصرار پر بالآخر وہ راشد کو حیدر آباد بھیجنے پر راضی ہو گئے۔ راشد کو خود بھی پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا۔ اس نے پانچویں جماعت بہت اچھے نمبروں سے پاس کی تھی۔ ماموں کے ساتھ حیدر آباد آکر وہ بہت خوش تھا، جیسے سچ مچ کی جنت میں آگیا ہو۔ میرے والد بھی ان دنوں محکمہ مال میں اچھے عہدے پر فائز تھے، تبھی رضیہ کے بھائی باہر سے ان کی اچھی سلام دعا تھی۔ جب ابا اور اماں حیدر آباد جاتے تو باہر صاحب کے گھر ضرور جاتے تھے۔ ان لوگوں کو رضیہ چاچی کے دگرگوں حالات کا دکھ تھا اور اب یہ ان کی مالی مدد کرنے لگے تھے، 'فیروز چچا غریب ضرور تھے مگر کبھی اپنی غربت کا ڈھنڈورا نہیں پیٹتے تھے۔ مالی مشکلات کے باوجود خاصے خود سر اور خود دار تھے۔ وہ کبھی باہر انکل کے در پر نہیں گئے نہ ہی ان سے کسی قسم کا رابطہ رکھتے تھے۔ فیروز چچا کی ایسی ہی سرشت تھی کہ وہ اپنے سے بہتر مالی پوزیشن والے رشتہ داروں سے گھلتے ملتے نہ تھے بلکہ ان کے در پر جانے میں اہانت محسوس کرتے تھے۔ راشد کی ممانی بہت اچھی خاتون تھیں۔ وہ تعلیم یافتہ تھیں، اس لئے تعلیم کی قدر جانتی تھیں، تنگ دل نہ تھیں۔ اس خاتون نے پہلے ہی دن راشد کو قبول کر لیا۔ اسے ماموں کے گھر کوئی تکلیف نہ تھی۔ ممانی اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی تھیں۔ جب سے راشد ان کے گھر آیا تھا، باہر کو بیوی اس کے قدموں کو مبارک سمجھنے لگی تھی کہ بارہ سال بعد اسے اولاد کی خوشی ملنے والی تھی۔ وہ جتنا جیب خرچ چاہتا، یہ عورت اسے دے دیتی اور ماں جیسا پیار بھی دیتی۔ اس قدر چاہت اور پُر سکون ماحول نے راشد کی شخصیت پر خوشگوار اثر ڈالا اور اس کی ذہانت چمک اٹھی۔ اب وہ سکول کا سب سے اچھا طالب علم تھا۔ ہر امتحان میں پوزیشن لینا، کھیلوں میں بھی آگے آگے رہتا تھا۔ اس کی محنت اور ذہانت سے ہر استاد خوش تھا۔ وہ ہر ایک کا چیتا بن چکا تھا۔ اب وہ غربت کی ذلت میں نہیں، ایک خوشحال گھرانے میں جی رہا تھا۔ گاڑی میں اسکول آتا جاتا، نوکر اس کی خدمت پر مامور تھا۔ لہذا خود اعتمادی کی دولت سے مالا مال ہو گیا تھا۔ ہنس مکھ اور خوش مزاج تھا، صرف ایک بات تھی کہ جب بھی اسکول میں کوئی دوست راشد سے اس کے والد کے بارے سوال کرتا تو وہ آدماس ہو جاتا اور بات کو ٹال جاتا۔ یوں وقت گزرتا رہا اور اس نے اٹھویں جماعت پاس کر لی۔ افتخار بھائی نے آرٹس کے مضامین لے لئے تھے جبکہ راشد نے اپنے لئے سائنس کو چنا۔ اس دوران چند دن کی چھٹیوں پر خانیوال آیا اور جلد لوٹ گیا۔ اسے ڈر تھا کہ اس کے والد روک نہ لیں اور تعلیم کا سلسلہ ٹوٹ جائے۔ میٹرک کے امتحان میں راشد نے فرسٹ پوزیشن لی۔ اس دوران اس کی ماں بیٹے سے ملنے کئی بار حیدر آباد گئی مگر راشد ایک بار بھی گھر نہ آیا۔ چھٹیوں میں اس کی ماموں کہنے کہ اپنے بابا سے مل لو مگر وہ انکار کر دیتا اور ٹال مٹول سے کام لیتا۔ ماں صبر سے واپس لوٹ جاتی کہ اس کو تو بیٹے کی خوشی اور اس کا مستقبل عزیز تھا، 'کالج میں وہ ہاکی کا بہترین کھلاڑی منتخب ہوا تو اس کا مزاج کچھ بدل گیا۔ اب وہ بڑے بڑے امیروں کے لڑکوں سے دوستی رکھتا تھا۔ رہن سہن شکل و صورت سے وہ کسی امیر زادے سے کم نہ تھا۔ ماموں کے پاس پیسے کی کمی نہ تھی۔ وہ اس کی جیب میں رقم ڈالتے رہتے تاکہ وہ کالج میں زیادہ بااعتماد اور

گیا۔ اس نے اپنے چچا زاد سوشل رہے۔ انہی دنوں میرے والد کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ افتخار کو تعلیم چھوڑ کر گھر سنبھالنا پڑا۔ ساتھ کاروبار میں شرکت کی اور ادھر مصروف ہو گیا کہ راشد سے بھی ملنے نہ جاسکا۔ ایک روز بھائی کو کاروبار کے سلسلے میں حیدر آباد جانا پڑا تب وہ راشد کے ماموں کے گھر گیا۔ پتا چلا کہ کالج ٹرپ پر گیا ہے۔ ایک کلاس فیلو سے بھائی نے ملاقات کی تو اس نے بتایا کہ راشد تو ایک ماہ سے کالج سے غائب ہے۔ ایک ماہ بعد کالج والوں نے اس کے ماموں سے رابطہ کیا۔ ماموں نے کہا دیا کہ وہ بیمار ہے اور خانیوال گیا ہوا ہے لیکن قصہ کچھ اور تھا۔ دراصل یہ لڑکا راشد سے کنورت رکھتا تھا۔ قصہ یوں تھا کہ کالج کا ایک لڑکا ابرار جس کے عزیز خانیوال میں تھے اور اس کے ان عزیزوں کا گھر بھی ہمارے محلے میں تھا۔ جب یہ لڑکا عزیزوں کے وہاں آیا تو چچا فیروز اس سے جا کر ملے اور بیٹے کے بارے دریافت کیا۔ یہ بھی کہا کہ وہ چھٹیوں میں بھی گھر نہیں آیا۔ کیا بہت پڑھ رہا ہے یا پڑھائی سے پہلے ہی بڑا آدمی بن گیا ہے۔ مجھ سے تو پہلے ہی دوری رکھتا تھا۔ ماموں کے گھر جا کر ہاتھ سے ہی نکل گیا ہے۔ فیروز چچا کی ایسی باتیں سن کر اس لڑکے کو دشمنی نکالنے کا موقع ملا۔ وہ بھی ہاکی کا کھلاڑی تھا مگر اچھا نہ کھیلنے کی وجہ سے اسے ٹیم سے الگ کر دیا گیا تھا، تب سے اس کے دل میں راشد کے لئے حسد پیدا ہو گیا تھا۔ اب جو موقع ملا تو فیروز چچا کے خوب کان بھرے کہ آپ کا لڑکا پڑھائی نہیں، عیش کر رہا ہے۔ ماموں کا کیا ہے، ان کا اپنا بیٹا تو ہے نہیں، جو راشد کا جی چاہے کرے، آج کل آپ کا لڑکا کھیلوں میں اول آرہا ہے۔ بڑا اچھا کھلاڑی ہے مگر پڑھائی کا کچھ پتا نہیں ہے۔ چچا فیروز خود پڑھے لکھے تھے نہیں، کھیل کا سُن کر (xax) بھنا گئے کہ میں یہاں اکیلا محنت مزدوری کر رہا ہوں اور وہ وہاں کھلاڑی بنا ہوا ہے۔ اگلے دن فیروز چچا حیدر آباد روانہ ہو گئے اور راشد سے کہا کہ گھر چلو، بہت کھلاڑی بن لئے اور بڑے عیش کر لئے۔ میں وہاں تنہا مزدوریاں کر رہا ہوں اور تیری بہنوں کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر میں گھلا جارہا ہوں۔ نہ میری ضعیفی کا خیال اور نہ عزت کا، مفت کی چیڑیاں جو مل رہی ہیں۔ بہنوئی نے بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانا۔ جب باہر انکل نے زیادہ اصرار کیا کہ لڑکے کو پڑھائی سے مت نکالو، اسے پڑھنے دو تو چچا اور بیہر گئے کہ تم ہی ہو جو اس کو اتنے روپے جیب خرچ کے دے کر خراب کر رہے ہو۔ یہ میرے بڑھاپے کا سہارا ہے۔ اولاد نرینہ کی اس لئے خواہش نہ کی تھی کہ یہاں پڑھنے کے بہانے کھیلے اور تم لوگ مجھے بے وقوف بناتے رہو۔ اتنی باتیں سنائیں کہ انکل باہر بھی غصے میں آگئے اور کہا کہ تھیک ہے، لے جانو اپنے لڑکے کو، میں نے اس کی کمائی نہیں کھائی۔ اگر پڑھ لکھ کر کچھ بن جاتا تو تم ہی کمائی کھاتے۔ میں نے تو اپنی بہن کی خاطر اسے رکھا اور پڑھارہا تھا۔ تم کو نہیں منظور نہ سہی۔ باپ بیٹے کو زبردستی گھر لے آیا۔ یہاں مسائل بھرے گھر میں راشد سخت ناامیدی کا شکار ہو گیا۔ باپ کا ڈنڈا کہ کمانوں کے تو کھالو گے۔ میں اب مزدوری کر کے تھک گیا ہوں۔ تمہاری بہنوں کا جہیز بنانا ہے اور شادی کے اخراجات بھی پورے کرنے ہیں۔ راشد بہت اُردہ تھا۔ وہ تو دل لگا کر پڑھ رہا تھا، اب ملازمت کے لئے دھکے کھانے پڑ گئے مگر جگہ جگہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ملازمت نہ ملی ادھر ماموں نے ناراض ہو کر ساتھ چھوڑ دیا، 'فیروز چچا کی اکھڑ مزاجی کے باعث ان کے تعلقات دوسرے عزیزوں سے بھی اچھے نہیں تھے جو اس کی مدد کرتے۔ بہر حال انہوں نے کہیں نہ کہیں سے قرض لے کر اُس کو کریانہ کی دکان کھول دی۔ وہ تعلیم چھوڑ کر کریانہ کی دکان پر تو بیٹھ گیا مگر بہت اداس اور بچھا بچھا بنے لگا۔ یہاں پر غربت، مایوسی اور طعنے ملے اور وہ انجینئر بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ ماحول کا تضاد اور باپ کی سختی کو سہ نہ سکتا تھا۔ باپ نے دکان کھول کر دے دی اور یہ بھی کہہ دیا کہ تم کمانو، ہم کھائیں گے۔ بہت تم نے عیش کر لئے، ایسی پڑھائی کہ دو ٹکے کی نوکری تک نہ ملی، کس کام کی ہے۔ وہ جو غربت کے دن بھلا چکا تھا، آٹھ دس سال سکون اور آرام کے ماموں کے گھر گزار آیا تھا، جہاں غم تھا اور نہ فکرات کا جہنم تھا۔ اچانک اس افتاد سے بوکھلا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں؟ اس کے لئے تمام راستے بند ہو چکے تھے۔ چھوٹی سی دکان سے کھان کھان چلتا ہے؟ جبکہ دکان چلانے والا بھی ایک ٹوٹے ہوئے دل کا ناتجربہ کار لڑکا ہو۔ راشد نے ماموں کو خط لکھا اور تمام حالات تحریر کر دیئے مگر باہر انکل تو چچا فیروز سے سخت نالاں تھے، لہذا انہوں نے بھانجے کو خط کا جواب نہ دیا۔ دکان میں لگا ہوا سرمایہ گھر کے راشن میں رفتہ رفتہ پورا ہوتا گیا۔ جب منافع نہ ہوا تو راشد سخت مایوسی کا شکار ہو گیا۔ باپ نے بے حد سخت سست کیا اور باور کرایا کہ ماموں کے گھر کے عیش و آرام اور کالج کے ماحول نے تم کو نکما کر دیا۔ دکان کو توڈبو بیٹھے ہو۔ قرض الگ چڑھ گیا ہے اب پھر سے نوکری ڈھونڈو شاید کہیں چپراسی ہی لگ جائے۔ وہ بیچارہ اور درخواستیں ٹائپ کروا کر میرے والد کے پاس آیا، انہوں نے بھی کوشش کی لیکن میٹرک پاس کو اچھی نوکری کیا ملنی تھی کہ چھوٹی موٹی نوکری کے لئے بھی کئی ایسے بے روزگار نوجوانوں نے درخواستیں دے رکھی تھیں جو گریجویٹ تھے۔ راشد بے شک محنتی، باصلاحیت تھا لیکن باپ نے اپنی ناعاقبت اندیشی کے سبب اس کی ذہنی صلاحیتیں سلب کر لی تھیں۔ فیروز چچا ان پڑھ ہی نہیں جلد باز بھی بہت تھے۔ تھوڑا سا صبر کے ساتھ انتظار کر لیتے اور راشد کو تعلیم مکمل کر لینے دیتے تو باہر نکل آسے کسی نہ کسی جگہ نہیں تو اسی مل میں اچھی ملازمت پر لگا سکتے تھے جہاں چچا فیروز کام کرتے تھے مگر چچا ایسے بٹ دھرم لوگوں کو کون سمجھا سکتا ہے۔ بے شک ان کی مالی مشکلات تھیں مگر انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ ان کے اکلوتے بیٹے کی تعلیم کا خرچہ کوئی دوسرا برداشت کر رہا ہے اور لڑکا حیدر آباد کے بہترین تعلیمی ادارے میں تعلیم پا رہا ہے۔ رہنے کھانے پینے کے علاوہ جیب خرچہ اور اچھے لباس کی سہولیات بھی ماموں نے اپنے ذمہ لے لی تھیں تب ان کو کچھ تو صبر و حوصلہ کرنا چاہئے تھا۔ ماں بچاری فریاد کرتی رہ گئی اور راشد کی تو اب یہ حالت تھی کہ جب بھی گھر میں گھستا، باپ کی تلخ باتیں بگھلے ہوئے سپسے کی طرح کانوں میں پڑتیں۔ باپ کی باتوں نے اس کے دل پر ایسے کچوکے لگا کہ کمرے میں جا کر رونے لگتا تھا۔ راشد ان دنوں بہت پریشان رہنے لگا تھا۔ راتوں کو بھی سوتا نہ تھا بلکہ روتا ہی رہتا تھا۔ اس کا غم دیکھ کر بڑی بہن بیمار رہنے لگی، دوسری کارشتہ اس لئے ٹوٹ گیا کہ بیابنے کو جہیز نہ تھا، لیکن ان باتوں کا ذمہ دار راشد تو نہ تھا کہ پر مصیبت اور بد قسمتی کا اسی کو ذمہ دار ٹھہرا دیا جاتا۔ سوائے میرے بھائی افتخار کے، کوئی بھی اس کی تکلیف اور ذہنی اذیت کو نہ سمجھ سکا، جو گھر آکر اپنے دوست کی پریشانی پر کڑھتا تھا۔ تنگ آکر راشد نے خواب اور گولیوں میں ساری ہمت اور تعلیم ڈبو دی۔ اس کی زندگی کے ساتھ یہ جدوجہد کی ادھوری کہانی بھی ختم ہو گئی۔ ماں اور بہنوں نے اس کے لئے جو خواب دیکھتے تھے، وہ اس کے ساتھ قبر میں دفن ہو گئے۔ باپ بھی ابیں کھینچتا مگر یہی کہتا کہ آہ تعلیم کی چابٹ نے میرے بیٹے کو مجھ سے چھین لیا اور ماموں پھتارہا تھا کہ اپنی انا کو عزیز رکھ کر اس نے پیارا اور ذہین بھانجا کھودیا۔ کاش وہ ایسی غفلت سے کام نہ لیتا۔ میں بھی ایک دن اپنے والدین اور بھائی

تھا۔ یہ کہانی صرف کے ہمراہ\xa0) رشد کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گئی تھی۔ وہ اپنی آخری آرام گاہ میں ابدی نیند سو رہا
رشد کی بی نہیں، اس جیسے کتنے ہی نوجوانوں کی ہے جو تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مستقبل
کے سنہرے خوابوں کے لئے جدوجہد بھی کرتے ہیں مگر حالات انہیں کیا سے کیا بنا دیتے ہیں۔
غربت کی ڈائن ہمارے وطن کے ایسے ہزاروں نوجوانوں کے عزائم اسی طرح نکل جاتی ہے کہ ماں باپ
بس آنسو ہی بہاتے رہ جاتے ہیں۔ کتنے المیے چھپا لیتی ہے یہ ہمارے خوابوں کی سرزمین...'n\]